﴿اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ کَرِیْمٌ﴾ (۱)

دنیا کی عظیم ترین نعمت
قرآنِ حکیم

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

شائع کردہ:

تنظیمِ اسلامی

مرکزی دفتر: A-67 علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو لاہور۔ 54000

فون: 36293939,36316638,36366638

ای میل: markaz@tanzeem.org www.tanzeem.org

(۱) الواقعۃ: 77

عرض ناشر

قرآن حکیم بلاشبہ نوعِ انسانی کیلئے خالقِ کائنات کا سب سے بڑا انعام اور سب سے عظیم نعمت ہے۔ یہ بھی اللہ کا بہت بڑا انعام ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے کسی کو اپنی اس آخری کتاب کی خدمت کی توفیق عنایت فرما دے، جیسا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی اس معروف حدیث میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: ((خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهٗ)) (رواه البخاری) ''تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے''۔ گویا تعلیم اور تعلّم قرآن سے وابستہ ہو جانے سے بہتر کوئی کام نہیں۔ مرکزی انجمن خُدّام القرآن کے صدر مؤسّس اور قافلہ رجوع الی القرآن کے حُدی خواں محترم ڈاکٹر اسرار احمد حَفِظَهُ اللّٰهُ[1] پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل ہے کہ اس نے آپ کو اپنی کتاب سے خصوصی تعلق و نسبت عطا فرمائی ہے۔ محترم ڈاکٹر صاحب کی تحریک رجوع الی القرآن اپنی عمر کے ۳۵ سال مکمل کر چکی ہے، تاہم ڈاکٹر صاحب کا دعوتِ قرآنی کا یہ سفر کم و بیش نصف صدی پر محیط ہے۔ میڈیکل کالج میں طالب علمی کے دور سے ہی آپ کا دروسِ قرآنی کا سلسلہ سروع ہو گیا تھا جسے اللہ تعالیٰ نے وہ شرفِ قبولیت عطا کیا کہ یہ درس ایک تحریک کی صورت اختیار کر گیا اور یہی تحریک بعد ازاں قرآن کے پیش کردہ نظامِ حیات کے قیام کے لیے جدوجہد کرنے والی ایک منظّم تنظیم کی شکل میں ڈھل گئی۔ ۲۹ رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ[2] کو سمن آباد میں نمازِ تراویح میں دورۂ ترجمہ قرآن کے ایک پروگرام کی اِختتامی تقریب میں ''دنیا کی عظیم ترین نعمت، قرآن حکیم'' کے عنوان سے محترم ڈاکٹر صاحب نے ایک اثر انگیز خطاب فرمایا، جس میں آپ نے عظمتِ قرآن، تحریک رجوع الی القرآن اور قرآنِ حکیم کے تقاضے جیسے اہم موضوعات پر نہایت عمدہ گفتگو فرمائی۔ اس خطاب کو کیسٹ سے صفحہ قرطاس پر منتقل کر کے اوّلاً جون ۲۰۰۰ء کے حکمت قرآن میں شائع کیا گیا تھا اور اب قارئین کے اصرار پر کتابی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے۔ امید ہے کہ یہ کتابچہ دعوتی مقاصد کے لیے نہایت مفید ثابت ہوگا۔

---

(۱) اللہ ان کی حفاظت کرے (۲) جنوری 2000ء

دیباچہ

ہدایت عطائے ربانی سہی لیکن ہم اس کیلئے دعا اور کوشش، دونوں کے پابند بنائے گئے ہیں اسی کوشش کا ایک حصہ یہ ہے کہ انسان ہدایت کے لفظی و اصطلاحی مفہوم کو سمجھ لے۔ پھر انسان کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ ہدایت کی اقسام کیا اور کتنی ہیں، ان کا سرچشمہ و منبع کیا ہے۔ پھر اس چشمہ صافی سے فیض یاب ہونے کا طریقہ و لائحہ عمل کیا ہے۔ زیرِنظر کتاب ہمیں ان تمام سوالوں کے جواب دیتی ہے۔ گہرے اور زیادہ معانی کو مختصر الفاظ میں بیان کرنا اگر کوئی فن ہے تو ڈاکٹر صاحب اس کے ماہر ہیں۔ یہ جامہ الفاظ اگر نثر میں ہو تو جہاں کمال کی بات ہے وہیں ایسی تحریر رک رک کر، ٹھٹھک کر، سوچ سوچ کر، بار بار پڑھنے کا تقاضا کرتی ہے۔ اللہ سے دعا ہے وہ ہمیں اسی طرح اس کتاب کو پڑھنے، ہدایت کو سمجھنے، حاصل کرنے اور عمل پیرا رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔

ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے اپنی تحریکی زندگی میں وہ کارِنمایاں سرانجام دیئے جن کا فیض عام اور خود ان کے میں اجر حسنہ کا سلسلہ جاری ہے۔ اسی فیضان کا ایک مظہر یہ ہے کہ ان کتابوں کی اشاعت، مشکل الفاظ و اصطلاحات کی آسانی کی غرض سے حاشیہ آرائی اور منقولہ روایات کے حوالہ جات کے حوالہ جات کی فراہمی سے ہم بھی اجر کما رہے ہیں، حالیہ اشاعت میں کسی حد تک اس نسخے کو مندرجہ بالا پہلوؤں کے اعتبار سے بہتر بنانے کی کوشش کی گئی۔ بعض مقامات پر عبارت کے اندر چند الفاظ یا جملوں کا اضافہ کیا گیا ہے اسے بریکٹس کی مدد سے ممتاز کر دیا گیا ہے کہ معلوم ہو سکے کہ یہ الفاظ بعد کا اضافہ ہیں تا کہ کتاب کی تاریخ کی امانت ہونے کا پہلو مسخ نہ ہونے پائے۔

(رحمت اللہ بٹر)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ارشادِ ربانی ہے ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِىْ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ﴾ (البقرۃ: ۱۸۵)

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِىْ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ﴾ ''رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا''۔اور قرآن کیا ہے؟ ﴿وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ﴾ ''ہدایت اور فرقان کی بیّنات''۔اس ترکیب میں جو تین الفاظ آئے ہیں اس میں سب سے پہلے ''ہدایت'' پر توجہ دیجئے کہ ''ہدایت'' سے مراد کیا ہے؟ اس کا ہم ترجمہ تو رہنمائی اور راستہ بتانا کرتے ہیں، لیکن ذرا گہرائی میں سمجھئے کہ ''ہدایت'' کسے کہتے ہیں؟

ہدایت کے دو پہلو

ہدایت کے دو حصے ہیں: ایک ہے انسان کے لیے نظری، فکری اور علمی ہدایت اور ایک ہے عملی، اخلاقی اور زندگی کے معمولات کے ضمن میں ہدایت۔نظری، فکری اور علمی ہدایت کے اہم ترین حصے کو ہندی (محاورے) میں ''سَت اَسَت وو یک''[۱] کہتے ہیں۔ یعنی انسان میں یہ تمیز پیدا ہو جائے کہ کیا چیز حق ہے اور کیا باطل ہے۔ ہندو جب اپنے مردوں کی ''ارتھی'' لے کر جاتے تھے تو کہتے تھے کہ ''رام نام ست ہے'' تو ''ست'' کے معنی ''حق'' کے ہیں۔قرآن مجید میں آتا ہے: ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ﴾۔اسی طرح ہندی میں اس حق کے لیے لفظ ''ست'' ہے۔ ہندی میں بعض الفاظ کے شروع میں اگر سابقے کے طور پر ''الف'' کا اضافہ کر دیں تو معنی الٹے ہو جاتے ہیں۔ مثلاً ''ٹل'' سے ''اٹل''۔اسی طرح ''مر'' سے ''امر'' اور ''ست'' سے ''است''۔''است'' وہ شے ہے جو نظر تو آرہی ہے لیکن حقیقی نہیں ہے، جبکہ ''ست'' وہ شے ہے جو حقیقت پر مبنی ہے۔سب سے بڑی بات یہی ہے۔ انگلستان کے بہت بڑے فلسفی ''بریڈلے''[۲] نے اپنی ایک معرکۃ الآراء کتاب "Appearance and Reality" میں اسی حقیقت کو بیان کیا ہے کہ ''جو کچھ نظر

---

(۱) تمیز (۲) Bradley

آ تا ہے وہ حقیقت نہیں ہے، بلکہ حقیقت اس کے پیچھے ہے''۔ جو کوئی محض آنکھوں سے نظر آنے والی چیزوں میں الجھ گیا وہ درحقیقت باطل (falsehood) کا شکار ہے، جب تک کہ اس ظاہر کے پردے کو چیر کر باطن کو نہ دیکھا جائے۔ اقبال نے کہا ہے ؎

گاہ(۱) مری نگاہِ تیز چیر گئی دلِ وجود
گاہ الجھ کے رہ گئی میرے توہمات میں

عربی کا ایک شعر ہے ؎

كُلُّ مَا فِي الْكَوْنِ وَهْمٌ اَوْ خيالٌ
او عُكُوْسٌ فى الْمَرَايَا اَوْ ظِلَالٌ

''یہ کائنات میں جو کچھ ہے وہم ہے یا خیال ہے، یا جیسے شیشوں کے اندر عکس ہوتا ہے یا جیسے سایہ ہوتا ہے''۔

اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ یہ مادی دُنیا اور مادی عالم بڑا ٹھوس نظر آتا ہے، یہ محسوس بھی ہوتا ہے، اس میں ہمیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو فوراً محسوس ہو جاتی ہے اور اس کی مسرت بھی فوراً محسوس ہوتی ہے۔ ہم اس کی تکلیف سے بھی متاثر ہوتے ہیں اور اس کی راحت سے بھی، لیکن اصل بات یہ ہے کہ انسان سمجھ لے کہ یہ نمود بے بود ہے، یعنی اس کی نمود تو ہے، حقیقت کوئی نہیں۔ حقیقت صرف ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔ قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ: ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ﴾ (الحج6، لقمان30) (اس سے معلوم ہوا کہ) یہ اس لئے کہ اللہ ہی ''الحق'' ہے۔

انسان کے اندر یہ تمیز پیدا ہو جانا اس کی بھی درحقیقت مختلف Corollaries ہیں۔ دراصل ہمارا ایک جسم ہے جو نظر آتا ہے، وزن رکھتا ہے اور اس کے تقاضے ہیں جو محسوس ہوتے ہیں۔ بھوک لگتی ہے تو اس کا احساس ہوتا ہے۔ پھنسی نکلتی ہے تو درد ہوتا ہے۔ اس کی مسرت بھی اور اس کی تکلیف بھی محسوس ہوتی ہے۔ لیکن ہمارا حقیقی وجود یہ نہیں ہے، حقیقی وجود وہ روحانی وجود ہے جو نظر نہیں آتا۔ وہ Reality ہے، یہ Appearance ہے۔ یعنی یہ ظاہر ہے اور وہ اصل حقیقت ہے۔ اسی طرح یہ دنیا کی زندگی ہے، عظیم کائنات ہے، Galaxies

---
(۱) کبھی

ہیں، ایسے ایسے ستارے ہیں جو سائز میں ہمارے سورج سے لاکھوں گنا بڑے ہیں۔ پوری کائنات کی وسعت کو دیکھیں تو یہ ہمارا سورج بھی ایک ذرّہ معلوم ہوتا ہے، اور ذرّے کا دل چیریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اندر پورا سورج موجود ہے ع ''لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں!'' ان ذرّات کا دل چیر کر ایٹمی توانائی نکالی گئی ہے ع ''مہرِ درخشاں[۱] ذرّۂ فانی، ذرّۂ فانی مہرِ درخشاں!'' لیکن یہ سب appearance ہے، حقیقت نہیں ہے۔

اگر یہ بات دل میں ٹھک جائے تو گویا انسان کی نظری، فکری اور علمی رہنمائی ہوگئی اور اگر نگاہیں یہیں اُلجھی ہوئی ہیں اور دلچسپیاں انہی ظاہری چیزوں میں ہیں اور بھاگ دوڑ انہی کے لیے ہے، انہی کو زندگی سمجھا ہے، اپنے آپ کو اسی ظاہری جسم سے تعبیر کیا ہے تو آدمی چاہے فلسفی ہو، پی ایچ ڈی ہو، مُفسِّر، مُحدِّث، فقیہہ اور مفتی ہو، وہ درحقیقت اندھیروں (ظلمات) ہی میں ہے۔ اسی لیے قرآن کہتا ہے: ﴿يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمَاتِ اِلَى النُّوْرِ﴾ ''یعنی اللہ اہل ایمان کو اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے''۔ یہ جو ظواہر (Appearances) ہیں ان کی بجائے حقائق پر توجہ اور نگاہیں مرکوز ہوں تو یہ نظری ہدایت ہے جس کے لیے حضور ﷺ کی بڑی پیاری دعا ہے: ((اَللّٰھُمَّ اَرِنِیْ حَقِیْقَۃَ الْاَشْیَاءِ کَمَا ھِیَ)) ''اے اللہ! مجھے تو چیزوں کی حقیقت دکھا جیسے کہ وہ فی الواقع ہیں''۔ ظاہر تو سب کو نظر آ رہا ہے۔ کتّا بھی کار کو اگر اپنی طرف آتا دیکھ لیتا ہے تو راستہ بدل لیتا ہے۔ اگر ہم نے بھی یہ کر لیا تو کون سا بڑا تیر مار لیا تو پہلی بات یہ سمجھ لیجئے کہ نظری ہدایت یہی ہے کہ اس ظاہر و باطن کا فرق معلوم ہو جائے، حق اور باطل (reality and falsehood) پوری طرح واضح ہو جائیں۔ یہی بات سورۂ کہف میں بھی بیان ہوئی ہے۔ جب حقیقت پر باطل کا ملمع ہو جائے تو یہی دجّالیت[۲] ہے۔ دجل کسے کہتے ہیں؟ حقیقت پر کسی اور شے کا پردہ ڈال دینا۔ اسی اعتبار سے یہ دجّالیت ہے کہ ان تین حقیقتوں یعنی ذات باری تعالیٰ، روحِ انسانی اور حیاتِ اُخروی پر ان تین ظواہر یعنی کائنات، جسم حیوانی اور حیاتِ دنیوی کا پردہ پڑ جائے اور یہی دجل وفریب ہے اور جیسے جیسے سائنس ترقی کر رہی ہے یہ دجل بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ اس ظاہر کی دلکشی بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ یہ Appearance اور زیادہ دل کو موہ لینے

(۱) روشن سورج (۲) حقیقت کو چھپا دینا، دھوکہ دہی

والی چیز بنتی چلی جا رہی ہے۔ اس کی رونقیں بڑھتی جا رہی ہیں اور اس کی چمک دمک میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی
یہ صنّاعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

یہ جھوٹ اور "Falsehood" ہے، حقیقت نہیں۔

بہرحال پہلی بات نظری، فکری اور علمی ہدایت ہے۔ میں نے اس وقت دینی اصطلاحات یعنی ایمان باللہ، ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرۃ کے حوالے سے بات نہیں کی، بلکہ ایک نئے زاویے سے وضاحت کی کوشش کی ہے۔ اگر انسان میں ست است و ویگ، reality and falsehood حق اور باطل میں امتیاز، Reality and appearance کے مابین فرق و امتیاز کا وصف قائم ہو گیا تو اسے نظری، فکری اور علمی ہدایت حاصل ہو گئی۔

دوسری ہدایت عملی ہے۔ اس معاملے میں بھی قرآن کا فلسفہ سمجھ لیجئے کہ عملی ہدایت کا ایک درجہ انفرادی سطح پر ہے کہ میں کیا کروں کیا نہ کروں؟ اللہ تعالیٰ نے یہ انفرادی ہدایت ہر انسان کے دل میں ودیعت کر کے اسے دُنیا میں بھیجا ہے۔ اسے بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ خیر ہے اور یہ شر ہے، یہ نیکی ہے اور یہ بدی ہے، یہ بھلائی ہے اور یہ بُرائی ہے: ﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝﴾[1] (سورۃالشمس) نفس انسانی کو معلوم ہے کہ سچ بولنا اچھا ہے اور جھوٹ بولنا برا ہے، وعدہ کر کے پورا کرنا اچھا ہے اور وعدہ خلافی کرنا بُری بات ہے۔ بڑوں کی خدمت اور عزت کرنا اچھی بات ہے اور ان کے ساتھ بے عزتی کا معاملہ کرنا بُری بات ہے، والدین کے ادب اور خدمت پر مبنی رویہ اچھا ہے اور اگر ان کا لحاظ نہ ہو تو یہ بری بات ہے۔ اسے کون نہیں جانتا؟ یہ دوسری بات ہے کہ انسان کا مزاج ہی بگڑ گیا ہو تو اس وجہ سے وہ اپنے اندر کی اس ہدایت سے فائدہ نہیں اٹھا پاتا۔ لیکن جس وقت وہ غلط کام کر رہا ہوتا ہے اسے اندر سے ضمیر متنبہ کرتا ہے کہ تم غلط

(۱) ترجمہ: ''اور قسم ہے جان کی اور جیسا کہ اللہ نے اس کو سنوارا اور اللہ نے اس میں الہام کر دیا اس کا فسق و فجور بھی اور اس کا تقویٰ بھی''

کررہے ہو۔ اسی کا نام ''نفس لوّامہ'' ہے کہ جس کی قسم کھائی گئی۔ ﴿لَآ اُقۡسِمُ بِیَوۡمِ الۡقِیٰمَةِ① وَلَآ اُقۡسِمُ بِالنَّفۡسِ اللَّوَّامَةِ②﴾(سورۃ القیامه) ''نہیں! میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی۔اورنہیں! میں قسم کھاتا ہوں نفس ملامت گر کی''۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں اس انفرادی معاملے پر اتنا زیادہ زور نہیں دیا گیا، بلکہ انہیں معروف ومنکر کہا گیا ہے کہ جو چیزیں معروف اور جانی پہچانی ہیں یہی اچھائیاں اور بھلائیاں ہیں، پس ان کی پیروی کرو۔منکر وہ ہیں جن سے انسان کا نفس خود ہی نفرت کرتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ انسان اپنے کسی مفاد کی وجہ سے یا کسی وقتی جذبے کے تحت کسی منکر کا اِرتکاب کر لیتا ہے، لیکن اس کی فطرت اس وقت بھی اسے ٹوک رہی ہوتی ہے کہ غلط کام کررہے ہو۔انسان کو اصل احتیاج اجتماعی زندگی میں ہدایت کی ہے۔ یہاں آ کر جو پیچیدگیاں پیدا ہوجاتی ہیں ان کا حل عقلِ انسانی کے لیے محال مُطلق اور ناممکن ہے۔دُنیا میں آج تک تین اجتماعی مسائل کی نشاندہی ہوئی ہے:

1) عورت اور مرد کے درمیان حقوق وفرائض کے ضمن میں کیا توازن ہو؟ بیوی کے کیا حقوق ہوں اور شوہر کے کیا حقوق ہوں؟ یہ بڑا پیچیدہ مسئلہ ہے۔انسان اس معاملے میں افراط وتفریط[۱] کا شکار رہا ہے۔

2) اسی طریقے سے ایک مسئلہ اجتماعی نظامِ ریاست وحکومت کا ہے۔ایک فرد اور عام شہری کو کتنی آزادی ہونی چاہیئے اور اس پر کتنا جبر ہونا چاہیئے؟ اور اجتماعیت کو کتنا اختیار ہونا چاہیئے اور Checks and balances کا کیا نظام ہونا چاہیئے؟ پولیٹکل سائنس ساری کی ساری اس مسئلے کے گرد گھومتی ہے۔

3) اسی طرح سرمایہ اور محنت، کارخانے دار اور مزدور کے حقوق وفرائض میں کیا توازن ہونا چاہیئے؟ اس میں ذرا سے عدم توازن سے ظلم واستحصال[۲] کا بازار گرم ہوجاتا ہے۔ سرمایہ دار غریب کا خون چوستا ہے ۔

خواجہ از خونِ رگ مزدور سازد لعل ناب
از جفائے وہ خدایاں کشت دہقاناں خراب!

---

(۱) زیادتی اور کمی (۲) ناجائز فائدہ حاصل کرنا

''سرمایہ دار نے مزدور کے خون سے شراب کشید کی ہے جسے وہ شام کو کلب میں بیٹھ کر پیتا ہے اور زمیندار اور لینڈ لارڈ کے ظلم وستم سے کاشتکاری کی کھیتی خراب ہے کہ اس کا بچہ فاقے سے ہے، حالانکہ محنت ومشقت اسی کاشتکار کی ہے''۔

یہاں آ کر انسان بالکل گھٹنے ٹیک کر اللہ سے ہدایت کا طالب بنتا ہے۔ سورۃ الفاتحہ کے قرآن مجید کے بالکل شروع میں ہونے کی حکمت بھی یہی ہے کہ انسان پہلے خود کہہ رہا ہے:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ○ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ○﴾

''تمام شکر اس اللہ کے لیے ہے کہ جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔ جزا وسزا کے دن کا مالک ہے۔ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں''۔

ان حقائق تک تو وہ خود پہنچ گیا ہے۔ لیکن اس کے بعد آگے کہتا ہے کہ: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ○﴾ ''اے اللہ! ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت دے''۔

اس اجتماعی معاملے کو کہیں قرآن ''صراط مستقیم'' کہتا ہے اور کہیں ''صراطُ السّویٰ'' اور کہیں ''سواء السبیل'' کہتا ہے۔ مختلف الفاظ آئے ہیں۔ ان تمام پیچیدگیوں میں سے درمیانی، معتدل اور عدل پر مبنی راہ، جس میں افراط وتفریط نہ ہو، یہ اصل ہدایت ہے جس کیلئے قرآن نازل ہوا۔

اس بحث کے حاصل کلام کے طور پر جان لیجئے کہ ہدایت نظری کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے سامنے حق اور باطل Reality and appearance، سَت، اَسَت کے درمیان امتیاز واضح ہو جائے۔ اللہ حق ہے، آخرت حق ہے۔ آپ نے وہ دعا پڑھی ہوگی:

((اَنْتَ الْحَقُّ وَوَعْدُكَ الْحَقُّ وَقَوْلُكَ حَقٌّ وَلِقَائُكَ حَقٌّ وَالْجَنَّةُ حَقٌّ وَالنَّارُ حَقٌّ وَالسَّاعَةُ حَقٌّ وَمُحَمَّدٌ حَقٌّ وَّالنَّبِيُّوْنَ حَقٌّ وَالْقُرْآنُ حَقٌّ))[1] ''تو حق ہے اور تیرا وعدہ حق ہے اور تیرا قول حق ہے اور تجھ سے ملاقات ہے اور جنت حق ہے اور دوزخ حق ہے اور قیامت حق ہے اور محمد ﷺ حق ہیں اور نبیؑ حق ہیں اور قرآن حق ہے''۔

---

(۱) متفق علیہ

یہ تمام امورحق ہیں۔ باقی جونظر آ رہا ہے یہ سب باطل ہے۔سورۃ الحشر میں متنبہ کیا گیا: ﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ﴾ ''ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی جانوں سے غافل کر دیا''۔ ﴿يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ (الروم:۷) ''یہ دنیا کی زندگی کے ظاہر (appearance) کو ہی جانتے ہیں''۔حقیقت کونہیں جانتے۔ دنیا کی زندگی کی حقیقت معنوی کو جانتے تو اللہ کو پہچان لیتے اورآ خرت کوفوراً پہچان لیتے ۔لیکن یہ صرف دنیا کی زندگی کے ظاہرکو جانتے ہیں۔ یہ نظری ہدایت ہے۔

جہاں تک عملی ہدایت کاتعلق ہےتو ہر انسان کے لیےاس کی جبلی ہدایت اس کے اندر موجود ہے، جیسے پیٹ کھانے کو مانگتا ہے،جسم کے دوسرے تقاضے ہیں، ان کو پورا کیا جائے۔اس میں اسے ہدایت صرف اس بات کی دینا ضروری ہے کہ کیا حلال ہے اور کیا حرام ہی۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ سڑک کے ذریعے جب آپ مری جاتی ہیں تو ہرموڑ پر نشان لگے ہوتے ہیں کہ یہاں سے آرام سے گزرنا، ورنہ کھائی میں گر جاؤ گے۔سپیڈ کی حدود معین کر دی گئی ہیں۔اس طرح سے زندگی کے مختلف معاملات میں حدود اللہ معین کر دی گئی ہیں کہ ان حدود سے تجاوز نہیں کرنا، باقی یہ کہ خیر وشر کے بارے میں تمہیں بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ کیا خیر ہے اور کیا شر ہے، کیونکہ تمہیں خود ہی معلوم ہے۔البتہ اجتماعی زندگی کے اندر تم محتاجِ محض ہو کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت تمہیں ملے۔

اب اگلے لفظ پر آیئے ﴿بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ﴾ فرقان کا مطلب ہے حق و باطل میں فرق، سَت اَسَت میں فرق، Reality and appearance میں فرق۔ ''بیّنات'' وہ ہیں جواز خود روشن ہوں اور ایک جگہ پر سورہ عنکبوت میں فرمایا: ﴿بَلْ هُوَ اٰيٰتٌ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ﴾ ''یہ قرآن تو وہ آیات بینات ہیں کہ جو اہل علم کے سینوں میں (پہلے سے) موجود ہیں''۔

اسی لیے قرآن اپنے آپ کو تذکرہ وتبصرہ کہتا ہے۔''تَبْصِرہ'' کہتے ہیں کسی کو آنکھ کھول کر دکھا دینا اور ''تَذْكِرَہ'' کے معنی ہیں یاد دلا دینا کہ تمہارے اندر یہ سب کچھ موجود

ہے۔تمہارے اندر حق ہے،تمہارے اندر ذاتِ باری تعالیٰ کی تجلی ہے ۔

ہے ذوق تجلی بھی اسی خاک میں پنہاں
غافل تو نرا صاحب ادراک نہیں ہے!

اس لیے قرآن مجید جو ''بیّنات'' کا لفظ لاتا ہے تو وہ اس اعتبار سے کہ یہ انسانی روح کے لیے جانی پہچانی شے ہے، اس میں کوئی نئی شے نہیں ہے۔ اسی لیے بڑے پیارے انداز میں مولانا روم نے کہا ۔

خشک تار و خشک مغز و خشک پوست
از کجا می آید ایں آوازِ دوست

ساز کا تار بھی خشک، اس کا اندرونی اور بیرونی حصہ بھی خشک ہے پھر یہ دوست کی آواز کہاں سے آتی ہے۔

قرآن مجید کو سنتے ہوئے وہ شخص جس کا دل قوی اور زندہ ہو اور روح بیدار ہو تو وہ یوں محسوس کرتا ہے جیسے یہ میرے دوست کی آواز آ رہی ہے، اور گویا یہ تو میرے اپنے دل کی آواز ہے۔ حافظ ابن قیم ؒ کہتے ہیں: ''قرآن کے پڑھنے والے بہت لوگ ایسے ہیں کہ جب وہ قرآن کو پڑھ رہے ہوتے ہیں تو یہ نہیں سمجھتے کہ ہم مُصْحَف میں سے پڑھ رہے ہیں، بلکہ ایسے محسوس کرتے ہیں کہ جیسے قرآن ہمارے لوحِ قلب پر لکھا ہوا ہے اور ہم وہاں سے پڑھ رہے ہیں''۔

فطرتِ انسانی اور قرآن حکیم میں اس قدر ہم آہنگی اسی لیے ہے۔ یہ قرآن ﴿بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ﴾ ہے اور یہ ایسی روشن آیات ہیں جو علم والوں کے سینوں میں محفوظ ہیں''۔

دُنیا کی سب سے بڑی نعمت

اب آیئے اس بات کی طرف کہ یہ قرآن سب سے بڑی نعمت کیوں ہے؟ دراصل ہمارا نعمتوں کا تصور دولت، شہرت، اقتدار، جائیداد، اولاد، صحت وغیرہ تک محدود ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کوئی شے بھی نعمت نہیں ہے، نعمت صرف ایک ہے اور وہ ہدایت

ہے، ہدایت ہوگی تو دولت بھی نعمت ہے، صحت بھی نعمت ہے، ہدایت کی بناء پر آپ دولت اور صحت سے نیکیاں کمائیں گے اور اگر ہدایت نہیں ہے تو اسی صحت کی بنیاد پر بدمعاشیاں کریں گے، تو ظاہر ہے کہ ایسی صحت نعمت نہیں بلکہ زحمت ہے۔ ہدایت ہے تو زندگی نعمت ہے، زندگی کا ایک ایک لمحہ نعمت ہے، ہدایت نہیں ہے تو زندگی لعنت ہے۔ ہدایت ہے تو اولاد نعمت ہے، اسے آپ دین کے کام میں لگائیں گے اور اسے صدقہ جاریہ بنائیں گے۔ ہدایت نہیں ہے تو اولاد لعنت ہے جو آپ کیلئے عذاب کا باعث بنے گی۔ آپ نے حرام کے ذریعے سے جو کچھ کما کر جمع کیا ہے اس کو اللّلو ں تللّلو ں میں اُڑائے گی اور ان کی بدمعاشیوں کا حساب آپ کے کھاتے میں جمع ہوتا رہے گا۔ قرآن مجید میں دو جگہ کہا گیا ہے:

﴿فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ (التوبہ:55) اور قدرے مختلف الفاظ کے ساتھ التوبہ: 85)

''ان کے مال اور ان کی اولاد (کی کثرت) تمہیں دھوکے میں نہ ڈال دے،
اللہ تعالیٰ ان کے ذریعے ان کو دنیا کی زندگی میں عذاب دینا چاہتا ہے''۔

اگر ہدایت نہیں تو نہ دولت نعمت ہے، نہ اولاد نعمت ہے، نہ صحت نعمت ہے، بلکہ یہ سب ہماری تباہی کا سامان ہے، ہمارے جہنم میں جانے کیلئے تمہید ہے۔ ہاں پارس وہ شے ہے جس سے کوئی چیز چھو جائے تو وہ سونا بن جاتی ہے۔ اسی طرح ہدایت وہ شے ہے کہ اس کے ساتھ صحت بھی نعمت ہے، زندگی بھی نعمت ہے۔ اس کے باوجود بھی اگر کچھ کوتاہیاں ہو جائیں تو ان کی تلافی کا امکان ہے۔ انسان توبہ کے ذریعے اپنی غلطیوں کی تلافی کر لیتا ہے۔ ہدایت کے ساتھ اگر اقتدار نصیب ہو جائے تو خلق خدا کی بہتری کا سامان ہو جائے گا۔ اگر اقتدار ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آ جائے جن کے پاس ہدایت نہیں تو نتیجہ یہی نکلے گا کہ خلق خدا انہیں کوسے گی اور یہ خلق خدا کو لعنت کریں گے۔ تو معلوم یہ ہوا کہ اس دُنیا میں، اس آسمان کے نیچے اور اس زمین کے اوپر حقیقتاً نعمت صرف ایک ہے اور وہ ہدایت ہے جو کہ مطلقاً نعمت ہے، سرتاپا نعمت ہے اور جو ہر نعمت کو نعمت بنانے والی ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو پھر کوئی شے نعمت نہیں ہے۔

عظمت قرآن، بزبانِ قرآن

اس نعمت ہدایت کی عظمت کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ایک بڑی عجیب بات کی طرف میرے ذہن کو متوجہ کیا۔ وہ یہ کہ خود اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اپنے کلام کی جو عظمت بیان کی ہے اس کے ضمن میں سورۂ حشر کی ایک بڑی عظیم آیت ہے اور پھر دو آیتیں سورۂ یونس کی، چار سورۂ رحمٰن کی، چھ سورۂ عبس کی اور آٹھ سورۂ واقعہ کی۔ گویا ایک، دو، چار، چھ، آٹھ سیڑھیاں ہیں۔ پھر ایک عظیم آیت سورۂ جمعہ کی ہے جو کہ سورۂ واقعہ میں بیان کردہ منفی کردار کو مزید واضح کرتی ہے۔ میں اس وقت ان قرآنی آیات کے حوالے سے عظمت قرآن کی طرف صرف اشارہ کروں گا، کیونکہ قرآن کی عظمت فی نفسہٖ کیا ہے؟ یہ ہم سمجھ ہی نہیں سکتے۔ سورۂ حشر میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿٢١﴾﴾ ”اگر ہم اس قرآن کو پہاڑ پر اتار دیتے تو تم دیکھتے کہ وہ دب جاتا اور پھٹ جاتا اللہ کے خوف سے۔ یہ مثالیں ہم لوگوں کے غور وفکر کے لیے بیان کر دیتے ہیں“۔

قرآن کے بیان کا مقصد یہ ہے کہ یہ مضمون اتنا لطیف ہے کہ تمہارے ذہن کی گرفت میں نہیں آ سکتا۔ اس تمثیل کے ذریعے سے جو بھی کچھ سمجھ سکتے ہو، سمجھ لو۔ قرآن کی عظمت اپنی جگہ ہے۔ اقبال نے اس حقیقت کو ایک اور انداز میں کہا ہے ؎

فاش گویم آں چہ در دل مضمر است
ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
مثل حق پنہاں و ہم پیدا ست ایں
زندہ و پائندہ گویا ست ایں!

”اس کتاب کے بارے میں جو بات میرے دل میں پوشیدہ ہے اسے اعلانیہ ہی کہہ گزروں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب نہیں ہے بلکہ کچھ اور ہی شے ہے۔ جیسے اللہ کی ذات الحق ہے ویسے ہی یہ الحق ہے اور جو صفات اللہ کی ہیں یعنی زندہ و پائندہ اور گویا (متکلم) وہی صفات اس قرآن کی بھی ہیں“۔

آگے چلئے، دوآیتیں سورۂ یونس کی آئیں ﴿يَآيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ﴾ ''اے لوگو! دیکھوتمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت بھی آگئی ہےاورتمہارے سینوں کےاندر جوروگ ہیں ان کی دوابھی آگئی ہے''۔

دل اگرسخت ہوگئے ہیں تو ان کونرم کرنے کے لیے نصیحت بھی قرآن ہےاور پھر یہ کہ دل کے روگ کون سے ہیں؟ ان میں دنیا کی محبت ہے۔ یہ material world ، مایہ (ہندی میں اسے مایہ کہتے ہیں) حقیقت میں کچھ نہیں ہے۔اس کی محبت میں انسان گرفتار ہو گیا تو یہی ضلالت ہےاور یہی گمراہی ہے۔اس مایہ کی محبت کودل سے نکالنا،اسے اس است کے چکر سے نکال دیناہی درحقیقت اس کا علاج ہے۔قرآن اس حوالے سے یہ کام کرتا ہے کہ لوگوں کے سینوں میں جوروگ ہیں،یعنی مال کی محبت،شہرت کی محبت،اقتدار، دولت و جائیداد کی محبت، ان محبتوں کوکھرچ کھرچ کرنکال دیتا ہےاور پھراللہ تعالیٰ کی محبت کودل میں اس طرح داخل کرتا ہے کہ اصل محبوب اللہ تعالیٰ ہوجائے۔

اور پھرقرآن ﴿هُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ ہے،یعنی یہ اہل ایمان کے حق میں ہدایت بھی ہےاوررحمت بھی۔لیکن اصل بات دل کے ٹھکنے کی ہے۔ایک حدیث کامفہوم ہے کہ: اگرکسی شخص کواللہ تعالیٰ نے قرآن دیا ہواور پھر بھی وہ کسی دوسرے شخص کے بارے میں یہ سوچے کہ اس پراللہ کا کرم مجھ سے زیادہ ہوا ہے کہ اس کواللہ نے محل دیا ہے،اتنی لمبی کار دی ہے،یعنی اس پراللہ کا کرم زیادہ ہوا ہے تو اسنے قرآن کی بہت ناقدری کی۔اسے معلوم ہی نہیں کہ اس کے پاس کتنی بڑی دولت ہے۔کسی شخص کے پاس کوہِ نورہیرا ہواوروہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلا رہا ہوتواس کا مطلب تو یہ ہے کہ اسے پتا ہی نہیں کہ اس کے پاس کوہِ نورہیرا ہے۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتیؒ نے مجھے ہندی کا ایک دوہا سنایا تھا۔بھیکا ایک ہندی شاعرتھا،وہ کہتا ہے ؎

بھیکا بھوکا کوئی نہیں، سب کی گدڑی لال
گرہ کھول جانے نہیں اس بدیئے کنگال

یعنی کوئی انسان بھوکا نہیں ہے۔اللہ تعالیٰ نے ہرانسان کے دل میں اپنی معرفت گویا

کو وہ نور ہیرے کی صورت میں رکھی ہوئی ہے تو پھر وہ بھوکا اور مفلس کیسے ہو گیا۔ صرف دل کی گرہ کھولنے کی ضرورت ہے۔ چونکہ انسان اپنے دل کی گرہ کو کھولتا نہیں ہے، اس لیے محسوس کرتا ہے کہ بھوکا ہو گیا ہے، مفلس اور کنگال ہو گیا ہے۔ ﴿قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ﴾ "کہہ دیجئے کہ یہ اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے ہے۔ پس اس (نعمت) پر چاہئے کہ خوشیاں مناؤ۔ وہ بہتر ہے اس سے جو وہ جمع کرتے ہیں"۔ پس اس قرآن پر فخر کرو کہ اللہ نے ہمیں اتنی بڑی دولت دی ہے۔

سورۂ رحمٰن کی چار آیتیں: ﴿الرَّحْمٰنُ ① عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ② خَلَقَ الْاِنْسَانَ ③ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ④﴾ "رحمٰن، اس نے قرآن سکھایا، انسان کو تخلیق کیا، اسے بیان سکھایا"۔ چار چیزیں جو سب سے چوٹی کی ہیں اللہ تعالیٰ نے ان چار آیتوں میں جمع کر دی ہیں۔ اللہ کے ناموں میں سب سے پیارا نام "الرحمٰن" ہے۔ اہل عرب میں "اللہ" کا لفظ زیادہ معروف تھا، اور وہ "رحمٰن" کے لفظ سے بدکتے تھے، لیکن قرآن نے آ کر جس نام کو زیادہ نمایاں کیا ہے وہ "رحمٰن" ہے، کہ سب سے زیادہ محتاج ہم اللہ کی رحمت ہی کے ہیں۔ جبکہ حضور ﷺ نے یہ فرمایا: "جب تک رحمت خداوندی دستگیری نہیں فرمائے گی میں بھی جنت میں داخل نہیں ہو سکتا!" ہمارا تمہارا کیا معاملہ ہے۔ ﴿عَلَّمَ الْقُرْآنَ﴾ "اس نے قرآن سکھایا"۔ ویسے تو انسان کو سارے کا سارا علم اللہ تعالیٰ ہی نے دیا ہے۔ فزکس، الجبرا، جیومیٹری کس نے پڑھائی؟ کیمسٹری کس نے پڑھائی؟ لیکن سب سے اونچا علم قرآن کا ہے۔ ﴿خَلَقَ الْاِنْسَانَ﴾ "اس نے انسان کو تخلیق کیا"۔ ویسے تو ساری کائنات اللہ تعالیٰ ہی نے بنائی، فرشتے، جن، آسمان، زمین، سیارے اور ستارے بنائے، لیکن ان سب میں سے چوٹی کی مخلوق انسان ہے۔ ﴿عَلَّمَهُ الْبَيَانَ﴾ "اس نے اسے بیان سکھایا"۔ اسے بہت کچھ سکھایا ہے، سماعت، بصارت دی ہے اور بہت صلاحیتیں دے رکھی ہین، لیکن چوٹی کی چیز "بیان" ہے...... اس کا ایک نتیجہ نکلتا ہے، اور وہ یہ کہ اس چوٹی کے مصرف کو یعنی قوتِ بیانیہ کو چوٹی کی شے پر خرچ کرو۔ یعنی اس کو قرآن کے پڑھنے پڑھانے، سیکھنے سکھانے، سمجھنے سمجھانے میں صرف کرو۔ چنانچہ اسی قافیہ میں وہ حدیث آ جاتی ہے جو حضرت عثمان بن

عفان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ((خَيْرُكُمْ مَّنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهٗ)) (رواہ البخاری) ''تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جو قرآن سیکھیں اور سکھائیں''۔ سیکھنے سکھانے کے مختلف مراحل و مدارج ہیں۔قرآن کا صرف ناظرہ پڑھنا، سیکھنا سکھانا بھی ٹھیک ہے۔حفظ اور تجوید بھی ٹھیک ہے اور قرآن کو سمجھنا ہے تو اس کے لیے عربی سیکھنی پڑے گی۔ایک تو اس کا سرسری طور پر سمجھنا ہے اور دوسرے یہ کہ اس کی گہرائیوں میں اترنا ہے،اس کے فلسفے اور حکمت کو سمجھنا ہے،اسی سے اپنی معاشی زندگی کے لیے رہنمائی لینی ہے اور اسی سے اپنی سیاسی و سماجی زندگی کے لیے رہنمائی لینی ہے تو یہ اس کے مختلف مدارج ہیں،لیکن بہترین لوگ وہ ہیں جو قرآن پڑھیں اور پڑھائیں،سیکھیں اور سکھائیں۔

اب چھ آیتیں سورۂ عبس کی ہیں:

﴿كَلَّاۤ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝١١ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ۝١٢ فِیْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۝١٣ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍۭ ۝١٤ بِاَيْدِیْ سَفَرَةٍ ۝١٥ كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ ۝١٦﴾

''کوئی نہیں! یہ قرآن یاددہانی ہے، پس جو چاہے یاددہانی حاصل کر لے۔ یہ قرآن بڑے ہی باعزت، بلند اور پاکیزہ صحیفوں میں ہے اور اس کے کاتب ملائکہ مقربین ہیں جو کہ بہت ہی باعزت اور نہایت نیک ہیں''۔

یہ قرآن کی ایک اور اعتبار سے مدح ہے۔قرآن تو صرف یاددہانی ہے۔تمہاری روح کے اندر وہ سارا علم موجود ہے،تمہاری روح میں دبی ہوئی چنگاری موجود ہے۔جیسے چنگاری کے اوپر راکھ آ جاتی ہے اسی طرح تمہاری روح کے اندر موجود چنگاری پر راکھ آ گئی ہے۔قرآن صرف اس راکھ کو ہٹانے کے لیے آیا ہے، یہ دلوں کے زنگ کو دور کرنے کے لیے آیا ہے۔قرآن اندر کے سوئے ہوئے شعور کو بیدار کرنے کے لیے آیا ہے۔اس کے بعد فرمایا: قرآن بہت ہی باعزت صحیفوں میں ہے جو کہ بہت ہی بلند ہیں۔﴿اِنَّهٗ فِیْۤ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِیٌّ حَكِيْمٌ﴾(الزخرف) ''یہ قرآن تو ہمارے پاس ام الکتاب میں ہے''، ﴿بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ۝٢١ فِیْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ۝٢٢﴾(البروج) ''بلکہ یہ قرآن ہے بڑی شان والا،لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے''۔

اب آ یئے، ملاحظہ کیجئے آ ٹھ آ یتیں (۷۵تا۸۲) سورۃ الواقعہ کی:

﴿فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ۝۷۵ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ۝۷۶﴾

''نہیں! مجھے قسم ہے ان مقامات کی جہاں ستارے گرتے ہیں، اور اگر تمہیں علم ہوتو یہ بہت بڑی قسم ہے جو ہم نے کھائی ہے''۔

تمہیں معلوم نہیں۔ آج شاید انسان کو پتا چلا ہے کہ اس کائنات کے اندر بہت بڑے بڑے black holes ہیں جو کہ مَوَاقِعِ النُّجُوْمِ ہیں۔ یہ تو ماہرین فلکیات (astronomists) سے پوچھیں کہ یہ black holes کیا ہیں اور کس بلا کا نام ہیں؟ کوئی بڑے سے بڑا سیارہ قریب سے گزر جائے تو وہ ان میں دھنس جائے گا، فنا اور ختم ہو جائے گا:

﴿اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ۝۷۷ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ۝۷۸ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ۝۷۹﴾

''یہ بڑا باعزت قرآن ہے، چھپی ہوئی کتاب میں ہے۔ (وہ کتاب اللہ کے پاس لوحِ محفوظ میں ہے) اسے تو چھو ہی نہیں سکتے مگر صرف وہ کہ جو انتہائی پاک ہوں (یعنی فرشتے ہیں کہ جو اسے چھوتے ہیں)''۔

اگرچہ علماء نے اس آیت سے فقہی حکم نکال لیا ہے کہ بغیر وضو قرآن کو ہاتھ نہ لگایا جائے، لیکن یہاں اصل مفہوم کچھ اور ہے، اور وہ یہ کہ قرآن کے باطن تک انسان کی رسائی اُس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک کہ اس کا باطن بالکل پاک نہ ہو جائے، ورنہ وہ قرآن کے بھی ظاہر کے اندر الجھا رہے گا کہ یہ لفظ ہے، اس کا مادہ یہ ہے، یہ فعل ہے۔ اس بات کو مولانا روم اس طرح فرماتے ہیں ؎

ما ز قرآں مغزہا برداشتیم
استخواں پیش سگاں انداختیم

یعنی قرآن سے اس کا اصل مغز تو ہم نے لے لیا ہے اور خالی ہڈی کتوں کے آگے ڈال دی ہے، وہ خالی ہڈیوں میں لڑتے رہتے ہیں۔ پس اگر اندر پاک ہو گیا ہو تو قرآن کے باطن تک رسائی ہوگی، ورنہ آپ تفسیر لکھ دیں گے، لیکن آپ کی رسائی قرآن کے باطن تک نہیں ہوگی۔ تفسیریں تو غیر مسلم بھی لکھ دیتے ہیں۔ لوگوں نے بڑی بڑی کتابیں لکھ دی ہیں، حدیث کے بڑے بڑے انڈکس غیر مسلموں نے لکھ دیئے ہیں، لیکن یہ کہ قرآن کے

باطن تک ان کی رسائی نہیں ہو سکی۔

تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴿۸۰﴾ ''پھر اس کا اتارا جانا ہے (لوح محفوظ سے، کتاب مکنون ام الکتاب سے) اس ہستی کی طرف سے کہ جو تمام جہانوں کا رب ہے''۔

آگے اب منفی پہلو ہے۔ اب تک کی باتیں آپ کو اچھی لگ رہی تھیں، اب کڑوی بات ہے: ﴿اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ﴿۸۱﴾﴾ ''کیا اس قرآن جیسی چیز سے تم بے اعتنائی برت رہے ہو''۔ بے توجہی کر رہے ہو، اسے پڑھتے نہیں، پڑھتے ہو تو سمجھتے نہیں، سمجھتے ہو تو عمل نہیں کرتے۔ اتنی عظیم شے! کائنات کی عظیم ترین نعمت سے یہ سلوک! انگریزی ہم نے اتنی پڑھ لی کہ انگریزوں کو پڑھا دیں، لیکن عربی نہیں سیکھ سکے کہ قرآن سمجھ سکیں۔ آخر اللہ تعالیٰ کو کیا جواب دیں گے؟ پی ایچ ڈی میں، فزکس، کیمسٹری میں، ڈاکٹری میں نہ جانے کتنے کتنے سال لگا کر لوگ ڈگریاں لیتے ہیں کہ آدھی عمر گزر چکی ہوتی ہے۔ سب کچھ پڑھ لیتے ہیں، لیکن اتنی عربی نہیں پڑھ سکتے کہ قرآن سمجھ سکیں۔ اب یہ سمجھ لو قرآن اس کو کیا کہتا ہے: ﴿وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ﴿۸۲﴾﴾ ''تم نے اپنا نصیب یہ ٹھہرالیا ہے کہ قرآن کو جھٹلا رہے ہو''۔ اگرچہ زبان سے نہیں کہتے کہ قرآن جھوٹا ہے۔ لیکن اگر تم قرآن کو سچا اور حق سمجھتے تو کیا اس کے ساتھ یہ سلوک کرتے!

یہ وہ شے جس کو میں نے کہا ہے کہ reverse گیئر لگا ہے، جو میرے اور آپ کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔ اس کے لیے میں پھر ایک آیت کا حوالہ دے رہا ہوں اور وہ سورۂ جمعہ کی آیت نمبر ۵۔ اللہ تعالیٰ نے سابق امت مسلمہ...... جو **مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ** اور **ملعون ہیں** (یعنی یہودی)...... کی مثال دی ہے:

﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا﴿۵﴾﴾ (الجمعة)

''مثال ان لوگوں کی جو حامل تورات بنائے گئے، پھر انہوں نے اس کو نہیں اٹھایا (اس کی ذمہ داری ادا نہیں کی) اس گدھے کی سی ہے جس پر (کتابوں کا) بوجھ لدا ہوا ہو''۔

تحریکِ رُجوع اِلَی القرآن

اس ساری گفتگو کا عملی نتیجہ یہ ہے کہ پوری قوت کے ساتھ انفرادی اور اجتماعی سطح پر قرآن کی طرف رُجُوع کی ایک زبردست تحریک چلنی چاہئے جس میں لوگوں کو دعوت دی جائے کہ آؤ قرآن پڑھو پڑھاؤ، سیکھو سکھاؤ، سمجھو سمجھاؤ، اس کا علم حاصل کرو اور عام کرو۔ اب ۲۰۰۰ء شروع ہو چکا ہے۔ میں ۱۹۶۵ء میں دوبارہ لاہور منتقل ہوا تھا، یعنی اس تحریک کو شروع ہوئے ۳۵ برس گزر چکے ہیں۔ ۶۷ء سے اس سمن آباد سے دعوت رجوع الی القرآن کا آغاز ہوا۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ''شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم!''(۱) بڑا اطمینان اور سکون ہے کہ زندگی اسی کام میں لگی ہے۔ اپنی بہتر صلاحیت، بیشتر وقت، بہتر توانائیاں صرف اس کام میں صرف کی ہیں کہ قرآن پڑھو پڑھاؤ، سیکھو سکھاؤ، سمجھو سمجھاؤ۔ اور اللہ کا بہت بڑا فضل ہے، جس کا کچھ نقشہ سورۂ فتح کے آخر میں کھینچا گیا ہے: ﴿كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْاَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ﴾ جیسے ایک کسان نے کھیتی لگائی، ہل چلایا، بیج ڈالا، پانی دیا یا یہ کہ باران رحمت آ گئی تھی، اب اس نے دیکھا کہ بیج پھوٹ رہے ہیں اور پتیاں نکل رہی ہیں، پھر اس نے اپنا پٹھہ اٹھایا ہے، پھر ذرا اس کو گدرا کیا ہے، پھر وہ کھیتی اپنی نال پر کھڑی ہو گئی ہے۔ ﴿يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ﴾ اس کاشتکار کو وہ منظر بہت بھلا اور بہت اچھا لگتا ہے، وہ خوش ہوتا ہے اور اس کا دل باغ باغ ہوتا ہے کہ میری محنت بارور ہو رہی ہے۔ یہی معاملہ محمد رسول اللہ ﷺ کا تھا۔ ۲۳ برس کی دن رات کی محنت شاقہ میں ایسے ایسے مرحلے آئے کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ انتقال سے چند دن پہلے جس وقت آپ ﷺ مرضِ وفات کی کیفیت میں تھے اور جماعت میں شریک نہیں ہو رہے تھے اس حالت میں آپؐ کو بہت شدید تکلیف ہو رہی ہے۔ سر میں درد بہت شدید تھا۔ جس وقت ذرا سا افاقہ ہوا تو حجرے کے دروازے کا پردہ اٹھا کر دیکھا تو مسجد میں نماز ہو رہی تھی، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ امامت کرا رہے تھے۔ آپ ﷺ کے چہرے پر یہ سوچ کر تبسّم آیا کہ یہ میری کھیتی ہے جو میں نے لگائی ہے، آج یہ فصل میری نگاہوں کے سامنے ہے۔ اور

---

(۱) میں اپنی زندگی سے خوش ہوں کہ میں نے کوئی کام کیا

پھراس کے بعد پردہ ڈال دیا۔

اس تمہید کا مقصد یہ بتانا ہے کہ میں نے ۴۵ برس پہلے جس کام کا آغاز کیا تھا آج میں اس کھیتی کو اپنی نگاہوں کے سامنے پروان چڑھتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ میں نہیں سمجھتا کہ اِس وقت اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کی سو سے کم تعداد ہو گی جو اس قرآنی فکر کو درس وتدریس کے ذریعے عام کر رہے ہیں، اور یہ نوجوان بھی اب ادھیڑ عمر میں پہنچ رہے ہیں۔ یہ نصف صدی کا قصہ ہے، دوچار برس کی بات نہیں۔ میرے دو بیٹے اب چالیس کی دہائی میں ہیں اور میرے ساتھی نوجوان جو میرے ساتھ میرے درس میں شریک ہوتے تھے وہ fifties[1] کے آس پاس آ رہے ہیں۔ اتنے لوگ ہیں کہ جو اس کام میں لگے ہوئے ہیں۔ قرآن کا پڑھنا پڑھانا، سیکھنا سکھانا، سمجھنا سمجھانا ہو رہا ہے۔

میرے پردادا حافظ نوراللہ صاحب کی ۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے جائیداد ضبط کر لی تھی۔ چنانچہ وہ اپنے آبائی علاقے ضلع مظفر نگر (یوپی) کو چھوڑ کر مشرقی پنجاب کے قصبہ حصار میں منتقل ہو گئے۔ بعدازاں دو نسلیں تو ہماری ایسی گزری ہیں کہ جن میں کوئی قابل ذکر دینی کام نظر نہیں آتا، اور مسائل روزگار ہی اتنے گھمبیر[2] تھے کہ ''دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا'' والا معاملہ رہا۔ لیکن پھر اللہ کا شکر ہے کہ اس کے بعد تیسری نسل سے یہ کام شروع ہو گیا۔ آج میں سوچ رہا تھا کہ اللہ کے فضل وکرم سے میرے دو بیٹے حافظ ہیں۔ میرے تین چھوٹے بھائی ہیں اور تینوں کا ایک ایک بیٹا حافظ ہے۔ خاص طور پر میں یہاں برادرم اقتدار احمد مرحوم[3] (اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے) کا تذکرہ ضرور کرنا چاہوں گا۔ ان کے پاس میں خود یہ فرمائش لے کر گیا تھا کہ تم اپنا ایک بیٹا میرے حوالے کرو جو قرآن اکیڈمی میں ایک سالہ کورس کرے اور پھر اس کام میں لگے۔ انہوں نے اپنے منجھلے بیٹے حمید احمد کو اس کام کیلئے وقف کر دیا، لیکن وہ سعادت مند بچہ جلد ہی ایک حادثے میں انتقال کر گیا۔ اب میرے اندر اس بات کی ہمّت نہیں تھی کہ میں ان سے کسی دوسرے بیٹے کا مطالبہ کرتا، کیونکہ کاروبار کے تقاضے بھی ہوتے ہیں، لیکن میری کسی توقع یا مطالبے کے بغیر فوری طور پر اقتدار احمد مرحوم نے کہا کہ میرے چھوٹے بیٹے رشید ارشد کو اس کام میں

---

(۱) پچاس برس کی عمر (۲) گہرا، بھاری (۳) بانی ندائے خلافت

لگا لیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اسی حسن نیت کا نتیجہ نکلا ہے کہ اس بچے نے اس چھوٹی سی عمر میں یہاں دورۂ ترجمہ قرآن مکمل کیا ہے۔ یہ حافظ بھی ہے۔ **بحمدللّٰہ** میرے تین بیٹے بھی دورۂ ترجمہ قرآن کر چکے ہیں۔ عزیزم عاکف، اللہ کے فضل وکرم سے چار پانچ مرتبہ یہ سعادت حاصل کر چکے ہیں۔ ابھی امریکہ کے قلب شکاگو سے دورۂ ترجمہ کر کے آ رہے ہیں۔ میرے ایک اور شاگرد اس وقت نیو یارک میں دورۂ ترجمہ کی ذمہ داری نبھا رہے ہیں۔ اسی طرح پورے پاکستان کے اندر بہت بڑے پیمانے پر یہ کام ہو رہا ہے۔ یہ سب اللہ کا فضل ہے ﴿وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ﴾ ہمیں حکم دیا گیا کہ اللہ کا کوئی خاص انعام ہو تو اس کا تذکرہ بھی کیا کریں اور شکر کیا کریں۔ بحمداللہ میرے دو بیٹے، دو پوتے اور ساڑھے پانچ نواسے حافظ ہیں۔ ایک نے چونکہ پندرہ پارے کئے ہیں، اس لیے ساڑے پانچ کہا ہے۔ یہ سب کچھ اللہ کے فضل واحسان کا مظہر ہے۔

۱۹۴۷ء کی بات ہے، اگست یا ستمبر کا مہینہ تھا، ہم حصار میں محصور تھے۔ ہندو باہر سے آ کر پے بہ پے حملے کرتے رہتے تھے، ان سے دفاع کیلئے ہم نے مورچے لگا لیے تھے۔ بھائی جان[۱] نے اس وقت BSc انجینئرنگ اور میں نے میٹرک کا امتحان پاس کر لیا تھا۔ چنانچہ یہ فارغ وقت ہم ایک مسجد میں بیٹھ کر مولانا مودودیؒ کا رسالہ ترجمان القرآن جس میں سورۂ یوسف کی تفسیر چھپ رہی تھی، بڑے غور سے پڑھ رہے تھے۔ قرآن کا ذوق میرے اندر وہیں سے شروع ہوا۔ شوق پہلے بھی تھا، بلکہ یہ تو اس وقت سے تھا جب میں پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ اس وقت علامہ اقبال کا ایک شعر میرے ذہن میں چپک کر رہ گیا تھا ؎

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر!

اس وقت میری عمر دس گیارہ سال ہوگی، لیکن قرآن کو پڑھنے اور سمجھنے کا ذوق اس وقت پیدا ہوا جب ہم دونوں مل کر joint study[۲] کرتے تھے۔ پھر قرآن کی عظمت منکشف ہوئی۔ اس سے ایک دلچسپی اور لذّت پیدا ہوگئی اور اللہ تعالیٰ نے اس درجہ مناسبت

---

(۱) اظہار احمد قریشی (بانی اظہار لمیٹڈ)　　(۲) اکھٹے مطالعہ کرنا

عطا کی کہ اللہ کے فضل و کرم سے پھر میری زندگی تو اسی کام میں لگ گئی۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب کہا کرتے تھے کہ ہم نے عاشق قرآن تو بہت دیکھے ہیں لیکن فنافی القرآن ڈاکٹر اسرار کے سوا کوئی نہیں دیکھا، حالانکہ وہ مولانا احمد علیؒ کے بہت قریب رہے۔ جس زمانے میں حمایت اسلام ایک تبلیغی کالج ہوتا تھا اس وقت وہ اس کے پرنسپل تھے اور اس کے منتظم مولانا احمد علیؒ ہوتے تھے۔ ان کا ان سے بہت قریبی ربط تھا۔

بہر حال دعوتِ رُجوع الی القرآن کے حوالے سے میں آپ کو جو خوشخبری دے رہا ہوں وہ یہ کہ یہ جگہ جہاں آپ اس وقت بیٹھے ہیں اب یہ بھی جامع القرآن کی شکل اختیار کرے گی۔ یعنی جیسے حضور ﷺ نے [حجۃ الوداع کے موقع پر نسیٔ کے قاعدے کو منسوخ کرتے ہوئے] فرمایا تھا: ((اِنَّ الزَّمَانَ قَدِ اسْتَدَارَ كَهَيْئَتِهٖ يَوْمَ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ)) (صحیح بخاری) ''بے شک زمانہ گھوم پھر کر اسی (قدیم) تقویم پر آ گیا ہے جو اللہ کے آسمان و زمین تخلیق کرنے کے دن سے چلی آ رہی تھی''۔ قریش نے کیلنڈر میں اونچ نیچ کر دی تھی۔ انہوں نے اشہر حُرُم آگے پیچھے کر دیئے تھے، لیکن حجۃ الوداع کے موقع پر صحیح تقویم کے مطابق حج ہوا تھا۔ تو یوں سمجھئے کہ ۱۹۶۶ء سے جو تحریک قرآنی میرے پھوپھی زاد بھائی شیخ نصیر احمد مرحوم کے مکان 211-A این سے اور پھر مسجد خضراء سمن آباد سے درسِ قرآن کی صورت میں شروع ہوئی تھی اور پھر دس برس تک دعوت رجوع الی القرآن کا جو ڈنکا بجا ہے وہ اسی ارضِ سمن آباد میں تھا۔ پورے شہر سے کھنچ کھنچ کر لوگ آیا کرتے تھے اور اب یہ کہ منظور حسن صاحب جو اس جگہ کے مالک تھے ان کی خواہش تھی کہ یہ جگہ قرآن مجید کی دعوت کا مرکز بنے۔ میں اس بات کا اعلان کر رہا ہوں کہ قرآن اکیڈمی ماڈل ٹاؤن کی طرز پر یہاں بھی ان شاء اللہ تعالیٰ ایک چھوٹی سی جامع القرآن تعمیر ہوگی اور اسے ذرا چھوٹے پیمانے پر ایک مرکز کی حیثیت حاصل ہوگی۔ اب آپ اُس وقت کو غنیمت سمجھیں اور کمر کس لیں۔ عربی کلاسز شروع ہوں تو محنت و توجہ کے ساتھ عربی پڑھنے میں لگ جائیں۔ کوئی اور اجتماعات ہوں تو ان کے اندر پوری پابندی کے ساتھ شرکت کریں۔ تعمیر ہو تو اس میں دل کھول کر چندہ دیں اور پورے زور و شور کے ساتھ اس کی تعمیر میں حصہ لیں تا کہ

یہ جلد از جلد مکمل ہو سکے۔ یہاں ایک مسجد بھی بنے گی۔ ابھی تک مختلف مسجدیں مختلف مسلکوں کے نام سے پہچانی جاتی ہیں۔ کوئی دیوبندی مسلک کی مسجد ہے تو کوئی بریلوی مسلک کی۔ اسی طرح اہلِ حدیث اور شیعہ مسالک کی مساجد ہیں۔ لیکن یہ مسجد اسلام اور قرآن کی مسجد، یعنی جامع القرآن ہوگی اور اس کے ساتھ کسی فرقہ واریت کا معاملہ نہیں ہوگا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ وہ مرکز یہاں بنے گا۔

عظیم ترین نعمت کے تقاضے

اب ذرا ایک اور بات کا جائزہ لیجیے! دیکھئے، قرآن مجید سب سے بڑی نعمت ہے، تو اللہ تعالیٰ کے ہاں ان نعمتوں کا حساب بھی ہوتا ہے ﴿ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ﴾ ''پھر قیامت کے دن تم سے ان نعمتوں کے بارے میں حساب کتاب بھی ہوگا''۔ یعنی تم نے ہماری نعمت کا صحیح استعمال بھی کیا کہ نہیں۔ نعمت قرآنی کا استعمال ایک تو یہ ہے کہ قرآن پڑھو پڑھاؤ اور سیکھو اور سکھاؤ، اس کے نور کو عام کرو، چہار دانگ عالم[1] کو اس کی روشنی اور ہدایت سے منور کردو۔ لیکن اس کا دوسرا معاملہ یہ ہے کہ اس کتاب کے نظام کو قائم کرنے کے لیے تن من دھن کی بازی لگاؤ۔ یہ صرف پڑھنے کے لیے نہیں آئی ہے، یہ اس لیے آئی ہے کہ ہمارے سارے فیصلے اس کے مطابق ہوں:

﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ۝۴۴...... هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۝۴۵...... هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۝۴۷﴾ (المائدہ)

''جو اللہ کی اُتاری ہوئی شریعت کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہی تو کافر ہیں...... وہی تو ظالم ہیں (وہی تو مشرک ہیں)...... اور وہی تو فاسق ہیں''۔

ہم کیا ہیں؟ انفرادی طور پر (اللہ کا شکر ہے) ہم مسلمان ہیں، اجتماعی طور پر ہم کافر ہیں۔ ہمارا نظام کافرانہ ہے، ہماری معیشت سود پر مبنی ہے۔ یہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے خلاف بغاوت ہے۔ ہمارے خلاف اللہ اور اس کے رسول کا اعلانِ جنگ ہے۔ ہمارے معاشرے میں فحاشی، عریانی اور بے حیائی ہے۔ چنانچہ قرآن کے فیصلے کے مطابق ہمارا شمار

---

(۱) پوری دنیا

کن لوگوں میں ہوتا ہے؟

قرآن مجید کی دعوت کا خلاصہ یہ ہے کہ سارے نبیوں نے کہا: ﴿یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَالَكُمْ مِنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ﴾ ''اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو، جس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں''۔ اور ﴿اُعْبُدُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ○﴾ ''اللہ کی بندگی کرو اور میری طاعت کرو''۔ اور اللہ کی بندگی اور پرستش کرو لیکن اس کیلئے اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے۔ ﴿وَمَا اُمِرُوْا اِلاَّ لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَاءَ﴾ (البینة) ''اور انہیں اللہ تعالیٰ کی بندگی کا ہی حکم دیا گیا تھا اطاعت کو اسی کیلئے خالص کرتے ہوئے یکسو ہو کر''۔

اب ہماری بندگی تو اُدھوری ہے اور ادھوری بھی کہاں ہے؟ ہماری پوری اجتماعی زندگی تو اسلام و قرآن کے خلاف ہے۔ انفرادی زندگی میں ٹھیک ہے میں شراب نہیں پیتا، سود نہیں کھاتا، نماز پڑھتا ہوں، روزہ رکھتا ہوں، لیکن اس سے آگے اجتماعیت کا پہلا قدم شروع ہوتے ہی کفر شروع ہو گیا۔ آج ہمارے کتنے گھر ہیں جن میں شرعی پردہ ہے۔ میں رواجی پردے کی بات نہیں کر رہا، شرعی پردے کی بات کر رہا ہوں۔ اگر گھر میں شرعی پردہ نہیں ہے تو اجتماعیت کا تو پہلا قدم ہی غلط ہو گیا۔ کتنے لوگ ہیں جو حلال کھا رہے ہیں؟ کتنے کاروباری ہیں جو اپنے آپ کو بینک کے اوور ڈرافٹس[1] سے بچائے ہوئے ہیں اور کتنے لوگ ہیں جنہوں نے سودی قرضہ لے کر مکان نہیں بنائے ہیں؟ اس سارے کفر کے خلاف جب تک جدوجہد نہ ہو، سعی، محنت اور جہاد نہ ہو ہماری یہ جزوی ہدایت اللہ کے ہاں قبول نہیں۔ سورۃ المائدہ ہی میں فرمایا:

﴿قُلْ يٰاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَا اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾

''(اے نبی) کہہ دیجئے: اے کتاب والو (یہودیو، نصرانیو) تمہاری کوئی حیثیت ہماری نگاہ میں نہیں جب تک کہ تم توراۃ اور انجیل کو اور جو کچھ تم پر نازل کیا گیا ہے قائم نہیں کرتے''۔ [سمجھنے کی غرض سے اگر تورات و انجیل اور اہل کتاب کی جگہ قرآن اور اہلِ قرآن کو رکھ کر دیکھیں تو گویا اللہ تعالیٰ ہم سے فرماتے ہیں]۔

---

(۱) Overdrafts

﴿يٰٓاَهْلَ الْقُرْآنِ لَسْتُمْ عَلٰى شَیْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا "الْقُرْاٰنَ" وَمَا اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِنْ رَّبِّكُمْ﴾

''اے قرآن والو! تمہاری کوئی حیثیت نہیں جب تک کہ تم قرآن کو اور جو کچھ تم پر نازل کیا گیا ہے اسے قائم نہیں کرتے''۔

تمہارا منہ نہیں ہے کہ ہم سے بات کر سکو۔ کس منہ سے تم نماز پڑھ رہے ہو جب کہ تم نے اللہ کی کتاب کو قائم نہیں کیا۔ چنانچہ اب ہمارے لیے کرنے کا کام کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ میں اکیلا یہ کام نہیں کر سکتا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ سو پچاس یا ہزار دو ہزار آدمی مل کر بھی نہیں کر سکتے۔ لیکن جدوجہد اور کوشش تو کر سکتے ہیں۔ اپنی توانائیاں، صلاحیتیں، قوتیں، اپنے اوقات، اپنے وسائل اور اپنی اولاد کو تو اس کام کے لیے لگا سکتے ہیں۔ اگر ہم یہ بھی نہیں کرتے تو پھر یقیناً اس وعید کا شکار ہو جاتے ہیں کہ:

﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۵ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۵ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ○﴾

''کیا تم ہماری کتاب کے کچھ احکام پر عمل کرتے ہو اور کچھ پر نہیں کرتے؟ تو جان لو کہ تم میں سے جو کوئی یہ حرکت کرے اس کی سزا اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اسے دنیا میں ذلیل و خوار کر دیا جائے اور قیامت کے دن شدید ترین عذاب میں جھونک دیا جائے، اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے غافل نہیں ہے''۔(البقرۃ : 85)

اس سے بچنے کی ایک ہی شکل ہے۔ وہ یہ کہ غلبہ چونکہ باطل اور طاغوت کا ہے اور اللہ کا دین مغلوب ہے، میں اور آپ اس کے تحت رہنے پر مجبور ہیں، ہم سودی نظام کے اندر سانس لے رہے ہیں، میرے اور آپ کے سانس کے ساتھ سود اندر جا رہا ہے، تو پھر اس سب کے کفّارے کے لیے ہمیں کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہئے؟ جواب اس کا صرف یہ ہے کہ یہاں رہتے ہوئے ہمیں اپنی توانائیوں، قوتوں، صلاحیتوں، اوقات و وسائل و ذرائع کا کم سے کم حصہ اپنی ذات پر اور اپنے اہل و عیال پر اور زیادہ سے زیادہ حصہ ایسی جدوجہد میں لگا دینا چاہئے جس کے ذریعے دین کے نظام کو قائم کیا جا سکے۔ اگر یہ کر لیا تو کفارہ ادا ہو

جائے گا، جو گناہ اندر جا رہا ہے وہ دھل جائے گا۔ اسے آپ اقامت دین یا نظام خلافت کہہ لیں، قرآن کا قائم کرنا کہہ لیں، دین کا قیام یا نظام مصطفیٰ ﷺ کا قیام کہہ لیں۔ یہ نام مختلف ہو سکتے ہیں لیکن کام کی نوعیت ایک ہی ہے۔ عِبَارَاتُنَا شَتّٰی وَحُسْنُكَ وَاحِدٌ[1]۔

پھر اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ اگر آپ باطل کے تحت زندگی گزار رہے ہیں تو اس صورت میں آپ پر اقامت دین کی جدوجہد فرض عین ہے۔ میں یہ بات سوچ سمجھ کر کہہ رہا ہوں۔ میری پوری زندگی قرآن مجید کے پڑھنے پڑھانے میں گزری ہے۔ یہ بات میں اپنے مطالعہ قرآنی کی روشنی میں کہہ رہا ہوں کہ جو آدمی اس جدوجہد میں شریک نہیں ہے، اس کی نماز، نماز نہیں ہے، روزہ، روزہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ جب تک طاغوت کا کفر نہیں کرتا اس وقت تک اس کا اللہ پر ایمان معتبر ہی نہیں ہوتا۔

﴿فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى﴾ (البقرة: 256)

”پھر جو کوئی طاغوت کا کفر کرے اور اللہ پر ایمان لائے تو اس نے ایک مضبوط کنڈے کو تھام لیا“۔

طاغوت کا کفر پہلے ہے اور اللہ پر ایمان بعد میں ہے۔ اگر انسان طاغوت کے خلاف جدوجہد نہیں کر رہا اور اس کے تحت پھلنے پھیلنے اور پھولنے کی کوشش کر رہا ہے، جائیداد بنا رہا ہے، کاروبار بڑھا رہا ہے، تو اس کا مطلب ہے طاغوت کے ساتھ اس کی ہم آہنگی ہے، وہ اسے ذہناً قبول کر چکا ہے اور دل سے اسے مان چکا ہے۔ لہٰذا اس کی نماز منہ پر دے ماری جائے گی۔

التزام جماعت کی ضرورت و اہمیت

میرے مطالعے کا حاصل یہی ہے کہ دین کے لیے یہ جدوجہد ہم پر فرض ہے۔ اس ضمن میں یہ چار باتیں اپنے پلے باندھ لیں:

ا) اس جدوجہد کے لیے کسی جماعت میں شامل ہونا لازم ہے۔ کیونکہ یہ کام بغیر جماعت کے ممکن نہیں۔ یہ کام افراد نہیں کر سکتے۔ اسی لیے حضور ﷺ نے فرمایا:

((عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ))[2] ”(مسلمانو!) تم پر جماعت سے وابستہ رہنا ضروری ہے“۔

(۱) ہماری تعبیرات مختلف ہیں اور آپ کا حُسن ایک ہی ہے۔ (۲) سنن ترمذی

((يَدُاللّٰهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ))[1] ''اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہے''۔

اور ایک حدیث میں حضور ﷺ نے فرمایا:

((اَنَا اٰمُرُکُمْ بِخَمْسٍ اَللّٰهُ اَمَرَنِیْ بِهِنَّ: بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ))(مسند احمد)

''(مسلمانو!) میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دے رہا ہوں، اللہ نے مجھے اِن کا حکم دیا ہے: (میں تمہیں حکم دیتا ہوں) جماعت کے ساتھ رہنے کا، سمع وطاعت کا مظاہرہ کرنے کا، ہجرت اور اللہ کے راستے میں جہاد کرنے کا''۔

[یہ حدیث مبارکہ ہمیں ایک واضح لائحہ عمل بتاتی ہے وہ یہ کہ] جماعت کا التزام ہو اور جماعت بھی سمع وطاعت والی ہو، اور یہ جماعت پھر ہجرت اور جہاد کے مراحل سے گزر کر اللہ کے دین کو قائم کرے''۔

اس جماعت کا معین ہدف اقامت دین کی جدوجہد ہونا چاہئے۔ کوئی چھوٹا کام مثلاً تعلیمی، تبلیغی اور اصلاحی نوعیت کا نہیں ہونا چاہئے۔ ویسے تو یہ کہ اگر کوئی سگریٹ نوشی کے خلاف بھی مہم چلائے تو وہ بھی اچھا کام ہے۔ تمباکو نوشی سے لوگوں کو بچانا، یہ بھی اچھا ہے، برا نہیں۔ آپ اپنے محلے کی صفائی کے لیے ''انجمن حفظانِ صحت'' بنالیں تو یہ بھی بہت اچھی بات ہے۔ لیکن اس جماعت کا Declared Goal اقامت دین اور غلبہ دین کی جدوجہد ہونا ہونا چاہئے۔

۲) وہ جماعت انتہائی منظّم (disciplined) ہونی چاہئے۔

۳) یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اس جماعت کا طریقہ کار کیا ہے۔ ایک بات طے ہے کہ اگر وہ طریقہ کار رسول اللہ ﷺ کے طریقہ کار سے ماخوذ اور مُستنبط[2] نہیں ہے تو آپ کبھی منزل تک نہیں پہنچ سکتے۔

خلافِ پیمبر کسے راہ گزید که ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید!

پیغمبر ﷺ کے خلاف جس کسی نے بھی کوئی راستہ اختیار کیا وہ ہرگز منزل تک نہیں پہنچ سکے گا۔ چنانچہ [اقامت دین کے لئے] راستہ وہی اختیار کرنا ہوگا [جس پر گامزن ہو کر نبی

---

(۱)(سنن نسائی) وفی سنن الترمذی مَعَ الْجَمَاعَةِ (۲)اخذ کیا ہوا

اکرم ﷺ نے انقلاب برپا کیا تھا]۔ بقول امام مالکؒ:

((لَا يَصْلِحُ آخِرُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ اِلَّا بِمَا صَلُحَ بِهِ اَوَّلُهَا))

''اس امت کے آخری حصے کی اصلاح نہیں ہوگی مگر صرف اسی طریقے پر جس پر کہ پہلے حصے کی اصلاح ہوئی ہے''۔

۴) آپ کے لیے جس طرح بھی ممکن ہو اُس جماعت کی قیادت کے قریب ہو کر دیکھ لیں کہ دل کیا گواہی دیتا ہے کہ کیا یہ لوگ مخلص ہیں یا بہروپئے ہیں؟ یہ دین کے نام پر دُنیا کی کوئی دکان تو نہیں چمکا رہے؟ اگر دل ان لوگوں کے خلوص کی گواہی دے دے اور یہ جماعت بقیہ شرطیں بھی پوری کر رہی ہو تو پھر اس جماعت میں شامل ہونا فرضِ عین ہے۔ اگر باطل کے غلبے کے تحت زندگی گزارنے والے شخص کے لیے دین کے غلبے کی جدوجہد فرض عین ہے تو پھر اس فرض عین کو پورا کرنے کے لیے جماعت کا التزام بھی فرض عین ہے۔ یہ بات سمجھ لیجئے کہ جس طرح نماز کے لیے وضو فرض ہے، اس لیے کہ وضو کے بغیر نماز نہیں، اسی طرح چونکہ جماعت کے بغیر دین کی اقامت ممکن نہیں لہٰذا اگر اقامت دین فرض ہے تو التزام جماعت بھی فرض ہے۔

جماعت سازی کی مسنون اساس

جماعت سازی کے کئی طریقے ہیں۔ ایک طریقہ ہمارے ہاں انگریزوں کے ساتھ آیا۔ مثلاً جب نئی تہذیب آئی تو میز کرسی پر بیٹھ کر کھانا کھانا بھی اس کے ساتھ آیا۔ ظاہر ہے کہ یہ ہماری تہذیب تو نہیں ہے۔ حضور ﷺ کا طریقہ تو حدیث میں یوں مذکور ہوا ہے۔ ((مَا اَكَلَ النَّبِيُّ ﷺ عَلَى الْخِوَانِ قَطُّ)) (صحیح بخاری) کہ نبی کریم ﷺ نے کبھی خوان پر رکھ کر کھانا نہیں کھایا۔ حضور ﷺ کے زمانے میں میز کرسی تو تھی نہیں۔ ان کے ہاں اونچے گھرانوں میں ایک رواج تھا کہ ان کے پاس چھ چھ انچ اونچی چوکیاں ہوتی تھیں۔ زمین پر بیٹھ کر کھا رہے ہوتے لیکن آگے چھ انچ اونچی چوکی رکھی ہوتی، جسے ''خِوان'' کہتے تھے۔ اب بھی بعض گھرانوں میں یہ رواج موجود ہے۔ حضور ﷺ نے کبھی ''خوان'' پر بھی کھانا نہیں کھایا، لیکن یہ کہ اس کرسی میز کو کسی نے حرام نہیں کہا۔ یہ نئی شے تو ہے

لیکن حرام نہیں ہے۔کوئی ایسی دلیل نہیں ہے جس میں اس کی ممانعت آ گئی ہو۔ یہ صحیح ہے کہ مسنون نہیں ہے، لیکن حرام بھی نہیں ہے۔

اسی طرح ہندوستان میں انگریزوں کے آنے کے بعد جماعتیں بنانے کا طریقہ یہ بنا کہ پہلے اس کے مقاصد(aims) اور اہداف (objects) لکھ لیے جائیں۔ اس کے Articles of Association اور قواعد وضوابط کا تعین کر لیا جائے۔ گویا پورا دستور (Constitution) بنالیا جائے۔اب جو شخص بھی اس دستور کو مان لے گا وہ اس جماعت کا رکن بن جائے گا۔ پھر یہ ارکان اس جماعت کے امیر یا صدر کا انتخاب دو یا چار سال کے لیے کریں گے۔ جماعت بنانے کے اس طریقے کو بھی میں مباح و جائز سمجھتا ہوں۔اگر چہ یہ مسنون نہیں ہے، لیکن حرام بھی نہیں ہے۔ جیسے میز کرسی پر کھانا کھانا حرام یا مسنون نہیں ہے اسی طرح یہ طریقہ نہ مسنون ہے، نہ منصوص ہے اور نہ ماثور ہے، لیکن حرام بھی نہیں ہے۔ Constitutional Organization بھی ٹھیک ہے، اگر منظّم اور سمع و طاعت والی ہو۔ لیکن جس جماعت کا قرآن، حدیث، سیرت، سنت، خلافت راشدہ اور ہماری پوری تاریخ میں ذکر ہے وہ بیعت کا نظام ہے کہ کوئی اللہ کا بندہ ایسا ہو جس پر آپ کو اعتماد ہو کہ یہ آدمی ٹھیک ہے، دین کو جانتا ہے اور حقیقتاً یہ دین کی خدمت کرنا چاہتا ہے تو آپ اس سے شخصی طور پر بیعت کر لیں کہ میں آپ کا ساتھی ہوں، جو حکم آپ مجھے دیں گے میں کروں گا۔ میں خود بھی مشورہ دوں گا، اپنی رائے دوں گا، لیکن یہ کہ فیصلہ گنتی سے نہیں ہوگا کہ یہ اکثریت ہے اور یہ اقلیت ہے، نو آدمیوں کی رائے لازماً غلط ہے اور دس کی لازماً صحیح ہے۔ حالانکہ یہ ضروری نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ آٹھ آدمیوں کی رائے صحیح ہو اور بیس کی غلط ہو۔نظام بیعت میں فیصلہ امیر کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ......
فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِىْ بَايَعْتُمْ بِهٖ﴾(التوبة: 111)

''بے شک اللہ تعالیٰ نے مؤمنوں سے ان کی جانیں اور مال جنت کے عوض خرید لیے ہیں ....پس اس بیع پر کہ جو تم نے اللہ سے کی ہے خوشیاں مناؤ''۔

یہ بیعت اللہ سے بھی ہے اور اللہ کے نبیؐ سے بھی۔سورۃ الفتح کے اندر دو جگہ ذکر آ گیا:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ﴾

''بے شک جن لوگوں نے آپؐ سے بیعت کی تو یقیناً انہوں نے اللہ سے بیعت کی۔ اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھ پر ہے''۔

﴿لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَکَ تَحْتَ الشَّجَرَۃِ﴾

''بے شک اللہ مؤمنوں سے اس وقت راضی ہو گیا جب انہوں نے درخت کے نیچے آپؐ سے بیعت کی''۔

سورۃ الممتحنۃ میں خواتین کی بیعت کا ذکر آیا ہے۔ یہ نظام ہے کہ جو قرآن نے دیا، حدیث نے دیا اور سیرت میں بھی یہی نظام ہے۔ بیعت عقبہ اولیٰ اور عقبہ ثانیہ ہوئیں، بیعت رضوان بیعت علی الموت ہو رہی ہے۔ اسی بیعت پر خلافت راشدہ کا نظام چلا۔ حضرت ابوبکر، عمر، عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کی بیعت ہوئی ہے اور جس وقت خلافت ملوکیت میں بدلنے لگی اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ میدان میں آئے تو انہوں نے بھی بیعت لی کہ آؤ میرے ساتھ، ہم اس ملوکیت کے راستے کو بند کریں۔ یہ دوسری بات ہے کہ بیعت کرنے والے گھبرا گئے اور ابن زیاد کے تشدد سے خوف زدہ ہو کر انہوں نے بیعت توڑ دی۔ اس کا کوئی الزام حضرت حسین رضی اللہ عنہ پر تو نہیں۔ ہمارا یہ نظام تھا جس کو کہ ہم نے انگریزوں کے آنے کے بعد پس پشت ڈال دیا۔ حالانکہ ۱۹۱۳ء میں مولانا ابوالکلام آزاد نے جماعت ''حزب اللہ'' بنائی تو وہ بیعت کی بنیاد پر تھی۔ کچھ عرصہ کے بعد بیس کی دہائی میں شیخ حسن البنّاؒ نے مصر میں جو جماعت بنائی وہ بھی بیعت کی بنیاد پر تھی۔ لیکن مولانا مودودیؒ نے جب جماعت اسلامی بنائی وہ بیعت کی بنیاد پر نہیں تھی۔ البتہ ۱۹۳۰ء میں جب قادیانی فتنے کا مقابلہ کرنے کے لیے علماء جمع ہوئے اور انہوں نے مولانا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کو امیر شریعت بنایا تو ان سے بیعت کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے جو بیعت لی اس کے الفاظ سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ وہ کتنی گھمبیر بیعت ہے۔ یہ روایت مسلم شریف اور بخاری شریف دونوں میں موجود ہے۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

((بَایَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم عَلَی السَّمْعِ وَالطَّاعَۃِ ، فِی الْعُسْرِ وَالْیُسْرِ، وَالْمَنْشَطِ وَالْمَکْرَہِ، وَعَلٰی اَثَرَۃٍ عَلَیْنَا وَعَلٰی اَنْ لَّا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَھْلَہٗ،

وَعَلٰى اَنْ نَّقُوْلَ بِالْحَقِّ اَيْنَ مَا كُنَّا، لَا نَخَافُ فِی اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ))

''ہم نے اللہ کے رسول ﷺ سے بیعت کی تھی کہ آپ ﷺ کا ہر حکم سنیں گے اور مانیں گے (اطاعت کریں گے) چاہے کتنا ہی مشکل ہو اور خواہ آسان ہو، چاہے ہماری طبیعتیں آمادہ ہوں، چاہے ہمیں اپنی طبیعتوں پر جبر کرنا پڑے، چاہے آپ ہم پر دوسروں کو ترجیح دے دیں (ہم یہ نہیں کہیں گے کہ میں آپ کا پرانا ساتھی تھا آپ نے نو وارد کو مجھ پر امیر بنا دیا) جنہیں آپؐ امیر بنائیں گے ہم ان سے جھگڑیں گے نہیں اور جہاں بھی ہوں گے حق بات ضرور کہیں گے (اپنی رائے پیش کر دیں گے)۔ اور اللہ تعالیٰ کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہیں کریں گے''۔

اور اسی بیعت کے نظام پر ہم نے تنظیم اسلامی قائم کی ہے۔ ہماری بیعت میں صرف ایک لفظ کا اضافہ ہے۔ وہ اس طرح کہ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا ہر حکم واجب الاطاعت تھا۔ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا بھی ہر حکم واجب الاطاعت نہیں ہے۔ ان سے بھی کتاب وسنت کی دلیل پوچھی جائے گی۔ کتاب وسنت کے خلاف وہ کوئی حکم نہیں دے سکتے۔ چنانچہ ہم نے بیعت کے الفاظ یہ رکھے ہیں: اِنِّیْ اُبَايِعُكَ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِی الْمَعْرُوْفِ یعنی اس میں صرف دو لفظ بڑھا دیئے ہیں باقی وہی بات ہے۔

اس بیعت کے بارے میں اب میں آخری بات کہہ رہا ہوں۔ مسلم شریف میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ مَّاتَ وَلَيْسَ فِیْ عُنُقِهٖ بَيْعَةٌ مَاتَ مِيْتَةً جَاهِلِيَّةً))

''جو شخص اس حال میں مرا کہ اس کی گردن میں بیعت کا قلادہ (پھندا) نہیں تھا تو وہ جاہلیت کی موت مرا''۔

یہ بیعت تو ایسے ہی ہے جیسے آپ نے اپنی بکری کے گلے میں رسی ڈالی ہوئی ہے اور رسی کا ایک سرا آپ کے ہاتھ میں ہے۔ چنانچہ اب وہ بکری آپ کے پاس سے کہاں جا سکتی ہے؟ اس طرح سے گویا رسی کا ایک سرا بیعت کرنے والے کی گردن میں ہے اور دوسرا بیعت لینے والے کے ہاتھ میں ہے۔ صاف صاف بات کر رہا ہوں کہ گردن میں بیعت کے قلادے کے بغیر موت اسلام کی موت نہیں، بلکہ جاہلیت کی موت ہے۔

میری ان گزاشات کا تجزیہ کریں تو ظاہر ہو جائے گا کہ اقامت دین کے حوالے سے عملاً دو ہی صورتیں ممکن ہیں: یا تو اسلام کا نظام قائم ہے، نظام خلافت ہے، تو جو خلیفہ ہے اس کے ہاتھ پر بیعت ہوگی۔ اگر نہیں کریں گے تو جہنم میں جائیں گے اور اگر اسلام کا نظام قائم نہیں ہے تو ظاہر ہے وہ نظام خود بخود تو نہیں آئے گا، اس کے لیے محنت کرنا پڑے گی، جماعت بنانا ہوگی، کوشش کرنا ہوگی، چنانچہ جماعت کے امیر سے بیعت کرنا ہوگی۔ ان دو کے علاوہ تیسری شکل ممکن نہیں۔ یا نظام خلافت ہے یا نہیں ہے۔ دو ہی شکلیں ہیں، اور کوئی شکل نہیں۔ اگر نظام خلافت ہے تو خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت جیسے ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ کے ہاتھ پر بیعت تھی۔ اگر نظام خلافت نہیں ہے تو جو جماعت اس کو قائم کرنے کیلئے کھڑی ہو اس کے امیر کے ہاتھ پر بیعت ہوگی۔ پس ثابت ہوا کہ اگر کوئی مسلمان ہے اور وہ اسلام کی موت مرنا چاہتا ہے تو اسے بیعت کرنا ہوگی: ﴿اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝﴾ ''بیشک میری نماز، میری قربانی، میری زندگی میری موت اللہ رب العالمین ہی کے لیے ہے''۔(الانعام: 163)

میں نے جو دین کا تقاضا سمجھا ہے وہ آپ کے سامنے رکھ دیا ہے۔ اب آپ میں سے ہر شخص کے دل و دماغ کا فیصلہ ہے۔ دل دماغ گواہی دیں کہ بات ٹھیک ہے تو اس کو قبول کرنا آپ پر لازم ہے۔ اور اگر بات سمجھ میں نہیں آئی تو بے شک رد کر دیں یا اگر بات سمجھ میں آ گئی ہے کہ یہ کام تو صحیح ہے لیکن یہ تنظیم صحیح نہیں ہے تو کسی اور تنظیم کو دیکھیں۔ کسی نبی کی تنظیم تو آج موجود نہیں ہے۔ لہٰذا آپ کو اس کام کیلئے جو بھی بہتر نظر آئے اور آپ کے خیال میں جو بھی جماعت بہتر طریقے پر جدوجہد کر رہی ہے اس میں شریک ہو جائیے، لیکن کوئی شخص اپنے آپ کو اس سے فارغ نہ سمجھے، اس لیے کہ غلبہ باطل کے تحت زندگی گزارنے والے شخص کے لیے اقامت دین اور غلبہ دین کی جدوجہد فرضِ عین ہے اور یہ وہ فرض ہے کہ اگر اس کی طرف انسان توجہ نہیں دے رہا اور اس کے ضمن میں اپنی ذمہ داری پوری نہیں کر رہا تو میرے نزدیک ایسا شخص باقی فرائض کی ادائیگی کے باوجود اللہ کے ہاں اپنی اس کوتاہی پر جواب دہ ہوگا۔

اقول قولی هذا واستغفر الله لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات ○○

تنظیمِ اسلامی

مروجہ مفہوم کے اعتبار سے

نہ کوئی سیاسی جماعت نہ مذہبی فرقہ

بلکہ ایک اصولی

اسلامی انقلابی جماعت

ہے جو اولاً پاکستان اور بالآخر ساری دنیا میں

دینِ حق

یعنی اسلام کو غالب یا بالفاظ دیگر

نظامِ خلافت

کو قائم کرنے کیلئے کوشاں ہے!

امیر: **حافظ عاکف سعید**

مرکزی **انجمن خُدّامُ القرآن** لاہور

کے قیام کا مقصد

مَنبعِ ایمان ......اور...... سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے **علم وحِکمت** کی

وسیع پیمانے......اور......اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر واشاعت ہے

تاکہ اُمتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشأۃِ ثانیہ -اور- غلبۂ دینِ حق کے دَورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ